علامہ محمد حسین طباطبائی

عقائد شناسی

خدا کی معرفت و ضرورت کائنات کے ابدی حقائق کی روشنی میں

احساس اور ادراک جو انسان کی ہستی میں ایک دوسرے سے گندھے ہوئے ہیں، اپنی ماہیت سے اللہ اور کائنات کی ہستی کو نمایاں کرتے ہیں کیونکہ یہ بات ان لوگوں کے نظریہ کے برعکس ہے جو خود اپنی اور دوسری چیز کی ہستی کے بارے میں شک کرتے ہیں اور دنیا کو فریب اور دھوکہ سمجھتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ جب انسان پیدا ہوتا ہے وہ احساس اور ادراک کا مالک ہوتا ہے اور اپنے آپ کو اور دنیا کو جان لیتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اسے اس بارے میں کوئی شک نہیں ہوتا کہ وہ موجود ہے اور دوسری چیزیں بھی موجود ہیں۔ جب تک انسان، انسان ہوتا ہے یہ شعور اور علم اس میں موجود ہوتا ہے اور اس کے بارے میں نہ کوئی شک کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس میں کوئی تبدیلی ہوتی ہے۔

اس حقیقت اور ہستی کا ادراک جس کی انسان سوفسطائیوں اور شکی مزاج لوگوں کے نظریات کے برعکس اپنی عقل کے ذریعے تائید کرتا ہے ناقابل تغیر ہے اور اسے کبھی بھی باطل ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ دوسرے لفظوں میں انسان کی اپنی ہستی کی بنا پر سوفسطائیوں اور شکی مزاج لوگوں کا دعویٰ، جو حقیقت کی نفی کرتا ہے، کبھی بھی درست نہیں ہوسکتا۔ اس وسیع کائنات میں ایک مستقل اور جاودانی حقیقت ہے جو اس کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور وہ اپنے آپ کو عقل کے سامنے ظاہر کرتی ہے۔ تاہم اس دنیا کا ہر مظہر جو ایک ایسی حقیقت کا حامل ہوتا ہے جسے ہم حساس اور باشعور انسان کی حیثیت سے جانتے ہیں، جلد یا دیر، اپنی حقیقت کھو بیٹھتا ہے اور معدوم ہوجاتا

ہے۔ اس امر سے واضح ہوجاتا ہے کہ مرئی دنیا اور اس کے مختلف حصے حقیقت کا جوہر نہیں ہیں (جو کبھی بھی محو یا معدوم نہیں ہوتا) دراصل وہ ایک ابدی حقیقت کے محتاج ہیں جس کے ذریعہ وہ اپنی حقیقت اور وجود حاصل کرتے ہیں۔ جب تک وہ اس ابدی حقیقت سے وابستہ رہتے ہیں وہ ہستی کے حامل ہوتے ہیں اور جیسے ہی ان کا رشتہ اس سے ٹوٹ جاتا ہے وہ معدوم ہوجاتے ہیں۔[1] ہم اس ناقابل تغیر لازوال اور واجب الوجود حقیقت کو اللہ تعالیٰ کہتے ہیں۔

انسان اور کائنات کا باہمی رابطہ:

اس سے قبل اللہ تعالیٰ کی ہستی ثابت کرنے کے لئے ہم نے جس راستے کا انتخاب کیا تھا وہ ایک سیدھا سادہ اور واضح راستہ ہے جس پر انسان اپنی خداداد فطرت اور ذہانت کے ساتھ کسی الجھن کے بغیر گامزن ہوتا ہے لیکن چونکہ لوگوں کی اکثریت اپنے دنیاوی دھندوں میں مصروف اور حسی مسرتوں میں مگن ہے لہٰذا اس کے لیے اپنی خداداد، سادہ، بنیادی اور پاکیزہ فطرت کی جانب لوٹنا بہت مشکل ہوگیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے، جو ایک آفاقی اور سب کو برابر سمجھنے والا دین ہے، ایسے اشخاص کے لیے اللہ تعالیٰ کی ہستی ثابت کرنے کے لیے ایک اور راستے کا حصول ممکن بنادیا ہے۔ یہ ان لوگوں سے اسی راستے سے کلام کرتا ہے اور اللہ سے روشناس کراتا ہے جو اپنی سادہ اور بنیادی فطرت سے ہٹ گئے ہیں۔ قرآن مجید نوع انسان کو مختلف طریقوں سے معرفت الٰہی کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ بالخصوص انہیں دنیا کی تخلیق اور اس پر حاوی نظام کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ وہ انہیں دعوت دیتا ہے کہ وہ موجودات دنیا اور ''اپنے نفسوں'' کے بارے میں غوروفکر کریں[2] کیونکہ اپنی چند روزہ دنیاوی زندگی میں انسان خواہ کوئی راستہ اختیار کرے یا کسی حالت میں بھی ہو اسے عالم ہستی یا اس پر حاوی نظام سے باہر نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی عقل اور قوت ادراک آسمان اور زمین کے ان عجیب وغریب نظاروں کو نظر انداز نہیں کرسکتی جن کا وہ مشاہدہ کرتا ہے۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں یہ وسیع عالم ہستی جو ہماری نگاہوں کے سامنے پھیلا ہوا ہے،

پورے کا پورا اور اس کے تمام اجزا مسلسل تغیر وتبدل کی حالت میں ہیں۔ یہ ہر لحظہ اپنے آپ کو ایک نئی اور انوکھی شکل میں پیش کرتا ہے۔ یہ ان قوانین کے زیر اثر حقیقت کا روپ اختیار کرتا ہے جن میں کوئی استثناء نہیں۔ بعید ترین کہکشاؤں سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے ذروں تک جو اس کائنات کے اجزاء ہیں مخلوق کا ہر حصہ ایک اندرونی نظام رکھتا ہے جو حیرت انگیز طریقے پر ایسے قوانین کے تحت چلتا ہے جن میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں۔ دنیا اپنا دائرہ کار پست ترین حالت سے کامل ترین حالت تک وسیع کرتی ہے اور خود اپنے کمال کی منزل تک پہنچتی ہے۔

ان نظاموں سے بالا تر زیادہ عالمگیر نظام ہیں اور بالآخر مجموعی کائناتی نظام ہے جو دنیا کے لاتعداد حصول کو یکجا کرتا ہے اور مخصوص نظاموں کو ایک دوسرے سے مربوط کرتا ہے۔ یہ نظام مسلسل جاری ہے اور کسی استثناء یا خلاف ورزی کی اجازت نہیں دیتا۔

تخلیق کا نظام ایسا ہے کہ مثال کے طور پر اگر وہ کسی شخص کو زمین پر وارد کرتا ہے تو اسے ایسی بناوٹ عطا کرتا ہے کہ وہ اپنے ماحول میں خوش اسلوبی سے رہ سکے۔ وہ ماحول کو ایسے سانچے میں ڈھالتا ہے کہ انسان کی پرورش ایک مہربان دایہ کی طرح کی جاسکے۔ سورج چاند، ستارے، پانی، زمین، رات، دن، سال کے مختلف موسم، بادل، ہوا، بارش، زمین کی سطح پر بکھرے ہوئے اور اس کے اندر چھپے ہوئے خزانے ہی نہیں بلکہ فطرت کی تمام قوتیں اس شخص کی بہبود اور تسکینِ خاطر کے لیے سرگرم عمل ہوجاتی ہیں۔ اس قسم کی یگانگت اور ہم آہنگی مظاہر کے درمیان اور خود اس کے گھر میں موجود ہوتی ہے۔

اس قسم کا تسلسل اور ہم آہنگی دنیا کے ہر مظہر کی اندرونی ساخت میں بھی پائی جاتی ہے۔ اگر نظام تخلیق نے انسان کو خوراک عنایت کی ہے تو اسے وہ خوراک تلاش کرنے کے لیے پاؤں، پکڑنے کے لیے ہاتھ، کھانے کے لیے منہ اور چبانے کے لیے دانت دیے ہیں۔ اس نے متعدد ذریعوں سے جو ایک زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک دوسرے سے وابستہ ہیں انسان کو تخلیق کے آخری مقصد سے منسلک کر دیا ہے جس کو بقا اور کمال کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

بہت سے سائنسدانوں کو اس بارے میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے ہزاروں سال کی کاوش کے بعد مختلف اشیاء کے مابین جو لاتعداد تعلقات ظاہر کیے ہیں وہ کائنات کے اسرار اور ان کی بے شمار پیچیدگیوں کی ابتدائی کیفیت کے محض ادنیٰ نمونے ہیں۔ ہر نیا انکشاف انسان کو لاتعداد نامعلوم عناصر کی موجودگی کی خبر دیتا ہے۔ کیا کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ وسیع کائنات، جس کے مختلف حصے علیحدہ اور مجموعی طور پر اور ایک دوسرے سے باہمی تعلقات کی بنا پر لامتناہی علم اور قوت کا پتہ دیتے ہیں، کسی خالق کے بغیر اور بلا وجہ پیدا ہوگئی ہے؟ اور کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ مخصوص اور عالمگیر نظام اور پھر یہ پورا کائناتی نظام جس نے، کہ کیوں باہمی تعلقات پیدا کر کے کائنات کو ایک وحدت کی شکل دے رکھی ہے، کسی منصوبے اور تدبیر کے بغیر محض اتفاق سے وجود میں آگئے ہیں؟ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ کائنات کے مظہر نے وجود میں آنے سے پہلے اپنے لیے ایک نظام اور ایک قانون کا انتخاب کرلیا تھا جس پر وہ وجود میں آنے کے بعد عمل درآمد کرتا ہے؟ یا کوئی یہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ یہ دنیا، جو ایک وحدت ہے اور جس کے اجزاء میں مکمل یگانگت، ہم آہنگی اور وابستگی پائی جاتی ہے، مختلف ذرائع سے دیے گئے مختلف احکام کے نتیجے میں وجود میں آئی ہے؟

ظاہر ہے ایک باشعور انسان جو ہر واقعے اور مظہر کا رشتہ ایک سبب سے جوڑتا ہو اور جو بعض اوقات ایک ایسا سبب دریافت کرنے کے لیے، جس کا اسے علم نہ ہو، کافی تحقیق اور تفتیش کرتا ہو کبھی بھی یہ باور نہیں کرسکتا کہ دنیا ایک ایسی ہستی کے بغیر جو اس کا سبب ہو خود بخود پیدا ہوگئی ہو۔ ایسا شخص جب چند اینٹوں کو ایک دوسری ترتیب سے رکھے دیکھتا ہے تو سمجھ جاتا ہے کہ یہ کسی علم اور قوت کے حامل شخص نے رکھی ہیں اور ان کا پہلے سے طے شدہ کوئی مقصد ہے لہٰذا وہ کائنات کے وسیع نظام کو محض اتفاق کا نتیجہ نہیں سمجھ سکتا۔

دنیا پر حاوی نظام کے گہرے مطالعہ سے پتہ چل جاتا ہے کہ یہ دنیا اور اس کا نظام ایک قادر مطلق نے پیدا کیا ہے جو لامحدود علم اور طاقت رکھتا ہے اور اس دنیا کی رہنمائی ایک

مقصد کی جانب کرتا ہے وہ جزوی اسباب جو دنیا میں انفرادی واقعات وجود میں آتے ہیں بالآخر اسی تک پہنچ کر اختتام پذیر ہوتے ہیں۔ وہ ہر لحاظ سے اسی کے زیر تسلط ہوتے ہیں اور اسی کی دانش سے ہدایت پاتے ہیں۔ ہر موجود اس کا محتاج ہے جبکہ وہ کسی کا محتاج نہیں اور کسی طرح کے اسباب یا حالات کا سہارا نہیں لیتا۔

خداوند کریم فرماتا ہے:

''بے شک آسمان اور زمین میں ایمان والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں اور تمام جانوروں میں جو وہ (اللہ) زمین پر پھیلاتا رہتا ہے یقین کرنے والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں اور رات دن کے آنے میں جو رزق (پانی) اللہ نے آسمان سے نازل فرمایا اور اس سے زمین کو اس کے مرجانے کے بعد زندہ کیا اور ہواؤں کے چلانے میں عقلمند لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔ یہ اللہ کی آیتیں ہیں جنہیں ہم تمہارے سامنے ٹھیک ٹھیک پڑھتے ہیں تو اللہ اور اسکی آیتوں کے بعد کونسی بات ہوگی جس پر یہ لوگ ایمان لائیں گے۔'' (سورہ جاثیہ۔ آیات ۳تا۶)

اس دنیا کی ہر وہ حقیقت جس کا ہم ممکنہ طور پر تصور کرسکتے ہیں ایک محدود حقیقت ہوتی ہے جس کی واقعیت کا انحصار چند لازمی اسباب اور حالات پر ہوتا ہے۔ اگر وہ حالات اور اسباب موجود نہ ہوں تو وہ حقیقت دنیا میں موجود نہیں ہوسکتی۔ ہر حقیقت کی ایک حد ہوتی ہے جس کے آگے وہ اپنی ہستی کو نہیں بڑھا سکتی ہے۔ فقط اللہ ہی ایک ایسی ہستی ہے جس کی کوئی حد یا انتہا نہیں۔ اس کی حقیقت کامل ہے اور خواہ ہم کسی طرح بھی اس کا تصور کرنے کی کوشش کریں اس کی ذات لامتناہی ہے۔ اس کی ہستی کسی چیز پر تکیہ نہیں کرتی اور کوئی اسباب یا حالات ایسے نہیں جن کی اسے حاجت ہو۔ ظاہر ہے کہ جو چیز لامحدود ہو اس کے بارے میں ہم کثرت کا خیال بھی نہیں کرسکتے کیونکہ بالفرض اگر ہم کسی دوسری حقیقت کا خیال کریں گے تو وہ پہلی سے مختلف ہوگی۔ جس کے نتیجے میں دونوں محدود ہوجائیں گی۔ مثلاً اگر ہم ایک لامحدود

جسامت کا قیاس کریں تو پھر ہم اس کے ساتھ ساتھ ایک اور لامحدود جسامت کا قیاس نہیں کرسکتے اور اگر ہم ایک دوسری لامحدود جسامت فرض کریں تو وہ پہلی ہی ہوگی۔ پس اللہ ایک ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں۔

ہم پہلے اس بدوی کا ذکر کر چکے ہیں جس نے عین اس وقت جب جنگ جمل زوروں پر تھی حضرت علی علیہ السلام سے سوال کیا کہ کیا آپ وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ اللہ ایک ہے؟ جواب میں حضرت علیؑ نے فرمایا:

"اگر یہ کہا جائے کہ اللہ ایک ہے تو اس کے چار معنی ہیں۔ اس میں سے دو معنی باطل ہیں اور دو درست ہیں۔ جو دو معنی باطل ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ جب انسان یہ کہے کہ اللہ ایک ہے تو وہ تعداد اور گنتی کے بارے میں سوچ رہا ہو۔ یہ معنی باطل ہیں کیونکہ جس کا کوئی دوسرا نہ ہو وہ اعداد کے زمرے میں داخل نہیں ہوسکتا۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ جن لوگوں نے کہا اللہ تین میں سے ایک ہے (یعنی نصرانی) وہ کفر میں مبتلا ہوگئے۔ ایک اور معنی یہ ہیں کہ کوئی کہے کہ فلاں شخص ان لوگوں میں سے ہے یعنی اس جنس کی ایک نوع ہے یا ایک نوع کا ایک فرد ہے۔ جب اس معنی کا اللہ پر اطلاق کیا جائے تو یہ معنی بھی درست نہیں کیونکہ اس سے مراد کسی چیز سے اللہ کی مشابہت کے ہیں اور اللہ ہر مشابہت سے بالاتر ہے۔ جہاں تک ان دو معانی کا تعلق ہے جن کا اطلاق اگر اللہ تعالیٰ پر کیا جائے تو وہ درست ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ کو اس معنی میں ایک مانا جائے کہ اشیاء میں سے کوئی بھی اس سے مشابہ نہیں ہے۔ اللہ ان معنوں میں بے مثل ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اللہ ان معنوں میں ایک ہے کہ کیا ظاہر اطوار پر اور کیا دل میں یا تصور میں اس کی کثرت یا تقسیم کے بارے میں قیاس تک نہیں کیا جاسکتا۔ اللہ اس یکتائی کا مالک ہے۔"[۳]

حضرت علیؑ کا ارشاد گرامی ہے۔" اللہ کی معرفت اس کی توحید کی معرفت ہے۔"[۴] اس سے مراد یہ ہے کہ جب یہ ثابت کردیا جائے کہ اللہ کی ہستی لامحدود ہے تو یہ اس کی توحید کا

کافی ثبوت ہے کیونکہ ایک لامحدود ہستی کے مثل کا قیاس کرنا ناممکن ہے پس اللہ کی توحید کے اور بھی کئی ثبوت ہیں لیکن انہیں پیش کرنے کی حاجت نہیں رہتی۔

ذات الٰہی اور اس کی صفات

اگر ہم ایک انسان کی فطرت کا تجزیہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ اس کی ایک ذات ہے جو اس کی انفرادی انسانیت ہے اور اس کی کچھ صفات بھی ہیں جن کی بدولت اس کی ذات پہچانی جاتی ہے۔ مثلاً کسی ملک میں پیدا ہونے کی صفت یا کسی شخص کا فرزند ہونے کی صفت یا عالم اور فاضل یا طویل القامت اور خوبصورت ہونے کی صفات یا اس کے برعکس صفات، ان میں کچھ صفات مثلاً عالم اور فاضل ہونے کی صفات کے علیحدہ ہونے یا تبدیل ہونے کا امکان ہے تاہم یہ سب صفات اس کی ذات سے مختلف اور ایک دوسرے سے متفاوت بھی ہیں۔

یہ نکتہ (یعنی ذات کا صفات سے مختلف ہونا اور صفات کا ایک دوسرے سے مختلف ہونا) اس بات کا بین ثبوت ہے کہ ایک ذات جو صفات رکھتی ہے اور ایک صفت جو ذات کو متعارف کراتی ہے دونوں محدود ہیں کیونکہ اگر ذات لامحدود ہو تو وہ صفات کو اپنے اندر سمو لے گی اور صفات بھی ایک دوسرے میں شامل ہو کر ایک وحدت بن جائیں گی۔ مثلاً انسان کی ذات اور لیاقت ایک ہی چیز ہوگی اور لیاقت وہی چیز ہوگی جو علمیت ہوگی اور طویل القامتی اور خوبصورتی بھی ایک ہی چیز ہوں گی اور ان سب کے ایک ہی معنی ہوں گے۔

اس مثال سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ذات الٰہی کے بارے میں یہ تصور نہیں کیا جاسکتا کہ وہ بھی انہی معنوں میں صفات کی حامل ہے جن معنوں میں انسان صفات رکھتے ہیں۔ ایک صفت حدیں قائم کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اور ذات الٰہی تمام حدود سے بالاتر ہے (وہ اس نوعیت کی حد سے بھی جو درحقیقت ایک صفت ہے، بالاتر ہے۔)

صفات الٰہی کے معنی

ہم عالم ہستی میں کئی ایسے کمالات سے واقف ہیں جو صفات کی شکل میں ظاہر ہوتے

ہیں۔ یہ مثبت صفات ہوتی ہیں جن کے ظاہر ہونے پر اس چیز کی جس کی یہ صفات ہیں وجودی قیمت بڑھ جاتی ہے۔ ایک زندہ وجود مثلاً انسان اور بے جان وجود مثلاً پتھر کا مقابلہ کرنے سے یہ نکتہ بخوبی سمجھ میں آسکتا ہے۔ بلاشبہ یہ کمالات اللہ تعالیٰ نے پیدا کئے ہیں اور اپنی مخلوق کو عطا فرمائے ہیں۔ اب اگر یہ کمالات خدا میں مکمل طور پر موجود نہ ہوتے تو وہ دوسروں کو عنایت نہ کرتا اور ان کے ذریعے انہیں کامل نہ بناتا لہٰذا اگر ہم عقل سلیم کے فیصلے کو تسلیم کریں تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ اللہ جو ہر چیز کا خالق ہے علم، قوت اور ہر دوسرے حقیقی کمال رکھتا ہے۔ علاوہ ازایں جیسا کہ پہلے کہا جاچکا ہے کہ اس کے علم اور قوت کی نشانیاں اور نتیجے کے طور پر زندگی کے آثار نظام کائنات میں دیکھنے میں آتے ہیں۔

تاہم اللہ تعالیٰ کی ذات لامحدود ہے اس لیے یہ کمالات جنہیں اس کی صفات کہا جاتا ہے دراصل اس کی ذات ہی ہیں اور سب بعینہٖ ایک چیز ہیں۔ ذات اور صفات میں اور خود صفات کے مابین جو فرق نظر آتا ہے وہ فقط تصور کی سطح پر ہے۔ دراصل حقیقت ایک ہے جو واحد اور ناقابل تقسیم ہے۔[۵]

ذات سے صفات کو منسوب کرکے اسے محدود کرنے یا اس کی کاملیت کے اصول سے انکار کرنے کی فحش غلطی سے بچنے کے لیے اسلام نے اپنے پیروؤں کو اقرار اور انکار کے درمیان توازن قائم کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس نے انہیں ہدایت کی ہے کہ وہ اس بات پر ایمان رکھیں کہ اللہ علم رکھتا ہے لیکن وہ علم دوسروں کے علم کی مانند نہیں ہے۔ وہ طاقت رکھتا ہے لیکن وہ طاقت دوسروں کی طاقت کے مانند نہیں ہے۔ وہ سنتا ہے لیکن کانوں کے ساتھ نہیں۔ وہ دیکھتا ہے لیکن انسانوں کی طرح آنکھوں سے نہیں، وَعَلیٰ ھٰذا القیاس۔[۶]

صفات کے بارے میں مزید وضاحت :-

توضیح صفات عموماً دو قسم کی ہوتی ہیں: صفات کمال اور صفات نقص۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے۔ صفات کمال کی نوعیت مثبت ہوتی ہے اور وہ جس کی صفات ہوں، اسے بہتر

وجودی قیمت اور تاثیر عطا کرتی ہیں۔ جب ہم ایک زندہ، دانا اور قادر موجود اور ایک مردہ اور علم وقابلیت سے عاری موجود کے درمیان مقابلہ کرتے ہیں تو یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے۔

صفات نقص ان صفات کے برعکس ہیں۔ جب ہم ان ناقص صفات کا تجزیہ کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ یہ منفی صفات ہیں اور ان میں کمال کا فقدان ہے۔ (مثلاً جہالت، بے صبری، بدصورتی، بیماری، وغیرہ) لہٰذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ صفت نقص کی ضد صفتِ کمال ہے۔ مثلاً علم جہالت کی ضد ہے اور بے بسی قابلیت کی ضد ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے ہر مثبت صفت کو براہ راست اللہ تعالیٰ سے منسوب کیا ہے اور ہر ناقص صفت سے اسے منزہ قرار دیا ہے اور ان ناقص صفات کی نفی کو اس کی صفات گردانا ہے۔ مثلاً ارشاد ہوا ہے کہ ''وہ دانا اور قادر ہے'' یا یہ کہ ''وہ زندہ ہے'' یا یہ کہ ''نہ وہ سوتا ہے نہ اونگھتا ہے'' یا یہ کہ ''تم جان لو کہ تم اللہ کو شکست نہیں دے سکتے۔''

یہ نکتہ کبھی فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ اللہ مطلق حقیقت ہے جس کی کوئی حد یا انتہا نہیں لہٰذا جو مثبت صفت اس سے منسوب کی جائے اس کی بھی کوئی حد نہیں ہوگی۔ وہ نہ مادی ہے، نہ جسم رکھتا ہے اور نہ ہی مکان و زمان تک محدود ہے۔ تمام مثبت صفات رکھتے ہوئے وہ مخلوق جیسی صفات اور حالات سے ماورا ہے۔ ہر وہ صفت جس کا وہ درحقیقت مالک ہے محدودیت کے تصور سے مبرا ہے وہ فرماتا ہے: ''کوئی چیز اس کی مثل نہیں۔'' [۷] (سورہ شوریٰ، آیت ۱۱)

صفات فعل

اس کے علاوہ صفات کو صفات ذات اور صفات فعل میں بھی تقسیم کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات ایک صفت کا انحصار فقط موصوف پر ہوتا ہے مثلاً زندگی، علم اور قوت کی صفات ایک زندہ عالم اور قوی انسان پر منحصر ہوتی ہیں، کسی اور عامل کو درمیان میں لائے بغیر ایک شخص میں ان صفات کی موجودگی کا تصور کرسکتے ہیں۔

بعض اوقات ایک صفت فقط موصوف پر منحصر نہیں ہوتی بلکہ اس کا حامل ہونے کے

لئے بعض خارجی اشیاء کی ضرورت بھی پڑتی ہے۔تحریر گفتگو اور خواہش وغیرہ کے سلسلے میں یہی صورت ہوتی ہے۔ ایک شخص کا تب اس وقت بن سکتا ہے جب اس کے پاس کاغذ ،قلم ، دوات وغیرہ موجود ہو۔ وہ گفتگو اس وقت کرسکتا ہے جب کوئی دوسرا شخص موجود ہو جس کے ساتھ وہ گفتگو کر سکے اور خواہش اس وقت کرسکتا ہے جب وہ چیز موجود ہو جس کی اس کے دل میں خواہش ہو، فقط ایک انسان کی موجودگی یہ صفات پیدا کرنے کے لئے کافی نہیں۔

اس تجزیے سے یہ امر واضح ہوجاتا ہے کہ صفات خداوندی جو درحقیقت اللہ تعالیٰ کی ذات ہی ہیں فقط پہلی قسم کی ہوسکتی ہیں جہاں تک دوسری قسم کی صفات کا تعلق ہے (یعنی وہ صفات جوظہور پذیر ہونے کے لیے بیرونی عوامل کی محتاج ہیں) وہ صفات ذات یعنی خود ذات تصور نہیں کی جاسکتیں کیونکہ جو کچھ اللہ سے ماسوا ہے وہ اس کی مخلوق ہے اور مخلوق ہونے کی بناپر اس کی حیثیت ثانوی ہے۔

جو صفات تخلیق کے عمل کے بعد اللہ تعالیٰ سے منسوب ہوتی ہیں (مثلاً خالق قادر مطلق ، زندگی دینے والا وغیرہ)بعینہٖ اس کی ذات نہیں ہیں بلکہ اس سے مستزاد ہیں۔ وہ صفات فعل ہیں۔صفات فعل سے مراد یہ ہے کہ جب کوئی فعل وقوع پذیر ہوچکتا ہے تو اس صفت کے معانی اس فعل کے حوالے سے یہ سمجھے جاتے ہیں اور ذات سے نہیں (جو یہ فعل کرتی ہے) مثلاً خالق کے معنی تخلیق کے عمل کے بعد سمجھ میں آتے ہیں،تخلیق سے اللہ تعالیٰ کی صفت خلاقی کا پتہ چلتا ہے۔ اس صفت کا انحصار تخلیق پر ہے، اللہ تعالیٰ کی ذات پر نہیں لہٰذا اس صفت کے ظہور سے اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل نہیں ہوتی۔ شنیعیت ، ارادے، اور کلام، کی صفات کو ان کے لغوی معنوں میں صفات فعل تصور کرتی ہے(ارادے کے معنی کسی چیز کی خواہش کرنے اور کلام کے معنی اسلوب بیان کے ذریعے مطلب واضح کرنے کے ہیں۔) بیشتر سنی علماء کے مطابق یہ صفات علم پر دلالت کرتی ہیں اور اسی لیے وہ انہیں صفات ذات تصور کرتے ہیں۔[۸]

قضا وقدر:

قانون علیت تمامتر جہان ہستی پر کسی استثنا کے بغیر حکم فرما اور جاری ہے۔ اس قانون کے مطابق اس دنیا کا ہر مظہر ظہور پذیر ہونے کے لیے ایسے اسباب اور شرائط سے وابستہ ہوتا ہے جو اس کی حقیقت کو ممکن بناتے ہیں۔ اگر وہ تمام اسباب (جنہیں علت تامہ کہا جاتا ہے) موجود ہوں تو اس مظہر (معلول مفروض) کی پیدائش ضروری (جبری) ہوجاتی ہے اور اگر وہ تمام اسباب یا ان میں سے کچھ مفقود ہوں تو اس مظہر کی پیدائش محال ہوتی ہے۔

اس نظریہ کے مطالعہ اور تجزیہ سے مندرجہ ذیل دو مطالب واضح ہوجاتے ہیں:

۱۔ اگر ہم ایک مظہر کا مقابلہ مجموعی علت تامہ اور اس علت تامہ کے اجزاء سے کریں تو علت تامہ سے اس کا تعلق ضروری اور جبری ہوگا لیکن علت تامہ کے اجزاء میں سے ہر ایک جزو کے ساتھ (جسے علت ناقصہ کہا جاتا ہے) نقطاس کا تعلق ممکن ہوگا کیونکہ علت کے اجزاء معلول کے وجود کو ضروری نہیں بلکہ فقط ممکن بناتے ہیں۔

لہٰذا تمام تر جہانِ ہستی پر ضرورت حکم فرما ہے کیونکہ پیدا ہونے کی بناپر اس کے ہر حصے کا علت تامہ کے ساتھ لازمی تعلق ہے۔ اس کا ڈھانچہ کچھ ضروری اور قطعی حوادث کے سلسلے میں ترتیب دیا گیا ہے۔ اس کے باوجود اس کے اجزاء میں (یعنی ان مظاہر میں جو اپنی علت تامہ کے علاوہ کسی علت ناقصہ سے تعلق رکھتے ہیں) امکان کی صفت محفوظ رہتی ہے۔

قرآن مجید نے اپنی تعلیمات میں اس حکم کی ضرورت کو قضائے الٰہی کا نام دیا ہے کیونکہ اس ضرورت کا سرچشمہ وہ ذات ہے جو جہان ہستی کو وجود بخشنے والی ہے اور اس بناپر یہ ایک حتمی حکم اور قضا ہے جس کی خلاف ورزی ممکن نہیں۔ اس کی بنیاد عدل پر ہے اور اس میں کوئی استثناء یا امتیاز نہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''حکومت اور پیدا کرنا فقط اسی کے لئے ہے۔'' (سورہ اعراف۔ آیت ۵۴)

پھر فرماتا ہے:

"جب وہ کسی چیز کا فیصلہ کرلیتا ہے تو اس کے لیے کہہ دیا جاتا ہے کہ 'ہوجا' پس وہ ہوجاتا ہے۔(یعنی وجود میں آجاتی ہے)" (سورہ بقرہ۔آیت ۱۱۷)

مزید فرماتا ہے:

"(جب) اللہ حکم دیتا ہے تو کوئی اس کا حکم ٹال نہیں سکتا۔"

(سورہ رعد۔آیت ۴۱)

۲۔ علت کے اجزاء میں سے ہر جزو معلوم کو مناسب اندازہ اور نمونہ دیتا ہے اور معلول کی پیدائش ان مجموعی اندازوں کے مطابق ہوتی ہے جو علت تامہ میں اس کے لیے معین ہوتی ہے۔مثلاً جو اسباب انسان کے لیے تنفس وجود میں لاتے ہیں وہ مطلق اور غیر مشروط تنفس ایجاد نہیں کرتے بلکہ وہ منہ اور ناک سے متصل ہوا کی ایک معینہ مقدار، معینہ وقت، مقام اور شکل میں سانس کی نالی کے ذریعے پھیپھڑوں میں بھیجتے ہیں۔اسی طرح جو اسباب انسان کی بصارت کو وجود میں لاتے ہیں۔(اور خود انسان بھی ان کا ایک حصہ ہے) وہ بلاقید وشرط بصارت پیدا نہیں کرتے بلکہ اسے ایسی بصارت دیتے ہیں جو مختلف وسائل اور اعضاء کے ذریعے اس کے لئے نپی تلی ہوتی ہے۔یہ حقیقت بلا استثنا دنیا کے تمام مظاہر میں اور ان تمام واقعات میں جو اس میں رونما ہوتے ہیں موجود ہوتی ہے۔

قرآن مجید نے اپنی تعلیمات میں اس حقیقت کو "قدر" کا نام دیا ہے اور اسے اللہ تعالیٰ سے منسوب کیا ہے جو تخلیق کا سرچشمہ ہے۔

جیسا کہ فرماتا ہے:

"ہم نے ہر چیز کو اس کی "قدر" کے مطابق پیدا کیا ہے۔" اور "کوئی چیز ایسی نہیں جس کے ہمارے پاس خزانے نہ ہوں اور ہم ان میں سے ایک نپی تلی مقدار نازل کرتے ہیں۔" (سورہ حجر۔آیت ۲۱)

پس کائنات کا ہر مظہر اور ہر واقعہ جو رونما ہوتا ہے قضائے الٰہی کے مطابق اس کا وجود ضروری ہے اور اس سے مفر نہیں اور اسی طرح ''قدر'' کے مطابق ہر مظہر اور ہر واقعہ جو رونما ہوتا ہے وہ اس حد یا اندازہ سے سرِ مو تجاوز یا انحراف نہیں کر سکتا جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے مقرر کیا ہے۔

انسان اور اختیار

انسان جو فعل انجام دیتا ہے وہ جہانِ ہستی کے مظاہر میں سے ایک مظہر ہے اور دنیا کے دوسرے مظاہر کی طرح اس کا انحصار بھی کلی طور پر اس کے سبب پر ہے اور چونکہ انسان جہانِ ہستی کا ایک جزو ہے اور کائنات کے دوسرے اجزاء کے ساتھ اس کا وجودی تعلق ہے اس لیے ہم یہ نظریہ قبول نہیں کر سکتے کہ دوسرے اجزاء کا اس کے افعال پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ مثلاً جب انسان روٹی کا ایک لقمہ کھاتا ہے تو اسے فقط ہاتھ، پاؤں اور منہ اور علم، قدرت اور ارادے کے وسائل کی ضرورت ہی نہیں ہوتی بلکہ خارجی دنیا میں روٹی کا وجود اور اس کا انسان کی دسترس میں ہونا اور اسکے حصول میں کسی رکاوٹ کا نہ ہونا دوسری زمانی اور مکانی شرائط کا پورا ہونا بھی اس فعل کے انجام دینے کے لئے لازمی ہے۔ اگر ان میں سے ایک سبب بھی موجود نہ ہو تو اس فعل کا انجام پانا ممکن نہیں۔ اس کے برعکس ان سب (یعنی علت تامہ) کی موجودگی میں اس فعل کا انجام پانا لازمی ہو جاتا ہے۔ علت تامہ کے تمام اجزاء کی نسبت سے اس فعل کا ضروری ہونا انسان کی نسبت سے جو علت تامہ کا ایک جزو ہے اس فعل کے امکانی ہونے کے منافی نہیں ہے۔ انسان اسی فعل کو انجام دینے کا امکان یا اختیار رکھتا ہے۔ اگر اس فعل اور علت کے تمام حصوں کے تعلق میں ضرورت موجود ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس فعل اور علت کے کچھ اجزاء (جن میں سے ایک انسان بھی ہے) کا تعلق بھی ضروری اور جبری ہو۔

انسان کا سادہ اور غیر آلودہ ادراک بھی اس نقطۂ نگاہ کی تائید کرتا ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ لوگ اپنی خداداد فطرت کی بدولت ایک طرف تو کھانے پینے اور آنے جانے کا فرق پہچانتے

ہیں اور دوسری طرف صحت اور بیماری، بڑھاپے اور جوانی یا قد وقامت میں تمیز کرسکتے ہیں۔

پہلی قسم کی چیزوں کا تعلق انسان کے ارادے سے ہے اور وہ یہ افعال اپنے اختیار سے انجام دیتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ لوگ اسے کوئی کام کرنے یا نہ کرنے کو کہتے ہیں اور اسی بنا پر کبھی اس کی مدح یا مذمت کرتے ہیں لیکن جہاں تک دوسری قسم کی چیزوں کا تعلق ہے انسان کی ان کے بارے میں کوئی ذمہ داری نہیں اور نہ ہی ان کے متعلق کوئی خدائی احکام ہیں کیونکہ ان چیزوں پر اس کا کوئی اختیار نہیں۔

صدر اسلام میں انسانی اعمال کے دینی پہلو کے بارے میں دو مکاتب فکر تھے۔ ایک گروہ کہتا تھا کہ انسانی اعمال اللہ تعالیٰ کے تخلف ناپذیر ارادے کا نتیجہ ہیں۔ یہ لوگ انسان کو اپنے افعال میں مجبور سمجھتے تھے اور اس کے خیال کے مطابق ان کے اختیار اور ارادے کی کوئی قیمت نہیں تھی۔ دوسرا گروہ انسان کو اس کے افعال میں آزاد سمجھتا تھا۔ ان کے مطابق اللہ کے ارادے کا انسانی افعال سے کوئی تعلق نہیں تھا اور وہ افعال "قدر" کے حکم سے خارج تھے۔

لیکن اہلبیت رسولؐ کی تعلیمات کے مطابق، جو قرآن مجید کی ظاہری تعلیمات سے مطابقت رکھتی ہیں، انسان اپنے افعال میں مختار ہے لیکن مستقل (آزاد) نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے اختیار کے ذریعے اس پہلو کو چاہا ہے اور جیسا کہ ہم پہلے واضح کر چکے ہیں اللہ تعالیٰ نے علت تامہ کے تمام اجزاء کے ذریعے جن میں سے ایک انسان کا اختیار اور ارادہ بھی ہے اس فعل کو چاہا ہے اور اسے ضروری بنایا ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس چاہنے کے نتیجے میں وہ فعل ضروری ہے اور انسان بھی اس میں مختار ہے یعنی وہ فعل علت کے تمام اجزاء کی نسبت سے ضروری ہے اور ان میں سے ایک جزو یعنی انسان کی نسبت سے اختیاری اور ممکن ہے۔۹

حوالے:

ا۔ کتاب خدا میں اس دلیل کی جانب اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے: "کیا اللہ کے بارے میں کوئی شک ہوسکتا ہے جو کہ آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔" (سورہ ابراہیم۔

آیت ۔۱)

۲۔یہاں بھی اسی آیۂ مبارکہ کی طرف اشارہ ہے جو اوپر نقل کی گئی ہے۔ (یعنی ''ہم انہیں اپنی نشانیاں دکھائیں گے...'' مظاہر قدرت اور جو حقائق انسان کی روح میں ہیں اللہ کی نشانیاں ہیں۔

۳۔بحار الانوار جلد ۲ صفحہ ۶۵

۴۔ بحار الانوار۔ جلد ۲۔ صفحہ ۱۸۶

۵۔امام صادقؑ نے فرمایا: '' اللہ کی ہستی ناقابل تغیر ہے۔ جب جاننے کو کچھ نہ تھا اس کا علم اس کی اپنی ذات تھی، جب سننے کو کچھ نہ تھا، اس کی سماعت اس کی ذات تھی۔ جب دیکھنے کو کچھ نہ تھا تو اس کی بینائی اس کی ذات تھی اور جب کوئی چیز ایسی نہ تھی جس پر قدرت استعمال کی جائے تو قدرت اس کی اپنی ذات تھی۔'' (بحار الانوار۔ جلد ۲۔ صفحہ ۱۲۵)

اس مسئلے کے بارے میں اہلبیت رسولؐ کی بے شمار احادیث ہیں، ملاحظہ کریں نہج البلاغہ ، توحید صدوق (مطبوعہ تہران ۱۳۷۵ھ) عیون الاخبار، ابن قتیبہ (مطبوعہ قاہرہ ۳۵۔۱۹۲۵ء) اور بحار الانوار۔ جلد ۲۔

۶۔امام باقرؑ اور امام صادقؑ نے فرمایا '' اللہ ایک ایسا نور ہے جو تاریکی سے آمیختہ نہیں ہے۔ وہ ایک ایسا علم ہے جس میں جہالت نفوذ نہیں کرسکتی اور ایسی زندگی ہے جس کے لئے موت نہیں ہے۔'' (بحار الانوار۔ جلد ۲ صفحہ ۱۲۹)

امام علی رضاؑ نے فرمایا ہے: '' صفات الٰہی کے بارے میں لوگوں نے تین راستے اپنائے ہیں۔ پہلا گروہ وہ ہے جو سمجھتا ہے کہ اللہ بھی وہی صفات رکھتا ہے جو دوسروں کی ہیں۔ دوسرا گروہ صفات کی نفی کرتا ہے۔ صحیح راستہ تیسرے گروہ کا ہے جو صفات الٰہی کا قائل ہے لیکن انہیں مخلوق کی صفات کے مشابہ نہیں سمجھتا۔'' (بحار الانوار۔ جلد ۲ صفحہ ۹۴)

۷۔ امام صادقؑ نے فرمایا: '' اللہ کی تعریف زمان ، مکان ، حرکت ،تعبیر اور سکون کے ذریعے نہیں کی جاسکتی بلکہ وہ زمان ، مکان حرکت ،تعبیر اور سکون کا خالق ہے۔'' (بحار الانوار جلد ۲

صفحہ ۹۶)

۸۔ امام صادقؑ نے فرمایا۔" اللہ اپنی ماہیت میں ہمیشہ سے دانا تھا جب کہ جاننے کو کچھ نہیں تھا اور صاحب قدرت تھا جبکہ ایسی کوئی چیز نہیں تھی جس پر وہ اپنی قدرت مسلط کرتا۔"

حدیث کا راوی کہتا ہے:" میں نے کہا: اور وہ گویائی بھی رکھتا تھا؟ انہوں نے جواب دیا: کلام مخلوق ہے۔ اللہ تھا اور گویائی نہیں رکھتا تھا۔ پھر اس نے کلام پیدا کیا۔" (بحار الانوار۔ جلد ۲ صفحہ ۱۴۷) اور امام علی رضاؑ نے فرمایا ہے:" ارادہ لوگوں کے باطنی وجود سے جنم لیتا ہے اور اس کے بعد فعل ظاہر ہوتا ہے۔ جہاں تک اللہ کا تعلق ہے اس کا فعل پیدا کرنا ہے کیونکہ ہمارے برعکس اللہ نیت، مقصد اور نامربوط خیالات نہیں رکھتا۔" (بحار الانوار جلد ۲ صفحہ ۱۴۴)

۹۔ بحار الانوار۔ جلد ۳ صفحہ ۵

☆☆☆☆